بازو کی آستین بغل تک لپیٹ کر رکھتا تھا۔ نذر حسین کو سڑک پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کے علاوہ سکول کی جوان لڑکیاں بھی رک کر دیکھتیں اور اس سے بات کرنے کی آرزو ساتھ لے کر چلی جاتی تھیں۔ دراصل نذر حسین میں اتنا کوئی کمال نہیں تھا سارا اس کی مشین کا جادو تھا جو عجیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ آگے پیچھے چلتی تھی اور جس پر تین سلے تینوں پہیوں پر لگا تار پانی چھوڑتے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہ سلے بھی ہمارے شہر کے جانے پہچانے سلے تھے لیکن مشین کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان کے اندر اپنی اہمیت کے تقطے سے روشن ہو گئے تھے۔ اپنی آسانی کیلئے آپ یوں سمجھ لیں کہ نذر حسین گویا ایک جیٹ پائیلٹ تھا جس کے کروُ میں تین سلے شامل تھے۔ ان چاروں کی وجہ سے مشین چلتی تھی اور اس ایک مشین کی وجہ سے یہ چاروں زمین سے دو دو بالشت اوپر چل رہے تھے۔

اس روز نذر حسین نے انجن چلانے کی چھٹی کر دی اور سٹیج پر آکر جس خوش الحانی سے نعت پڑھی اس کے سامنے ضلع سے منگوائے ہوئے دونوں نعت خواں مٹی ہو گئے۔ سڑک کوٹنے کے انجن کا ڈرائیور ہونے کی حیثیت سے وہ ہیرو تو پہلے ہی تھا اب سب کی آنکھوں کا تارا ہو گیا۔ اب لوگ اس کے ساتھ ساتھ اور اس کے آگے پیچھے یوں بھاگنے لگے جیسے وہ انجن کے ساتھ ساتھ بھاگا کرتے تھے۔ سارے میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی اور کچھ اور ہی طرح کا سماں بندھ گیا۔ ہمارے قصبے نے پہلی مرتبہ ایک آرٹسٹ دریافت کیا اور اس کے در و بام تفاخر سے لبریز ہو گئے۔

شام کے وقت مغرب کی نماز سے پہلے ماسٹر ہالی اپنی کلف لگی شلوار قمیص پہنے، خس کا عطر لگائے، کالی سیاہ ریشمی ٹائی والی کالی سیاہ گرگابی پہنے چوبارے سے اترے اور آکر سیدھے مسجد کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس شاخوں، ٹہنیوں، پھولوں والے دروازے کے سامنے جس کے ساتھ کیلے کے پیڑ گاڑھے ہوئے تھے۔ اس دروازے اور ماسٹر صاحب کے درمیان بس ایک سڑک تھی جس پر ٹریفک رواں تھا۔ اس دروازے سے سو ڈیڑھ سو فٹ پرے مسجد کا دروازہ تھا۔ مسجد کے دروازے سے تقریباً اتنی ہی دور منبر تھا جس پر مولوی صاحب کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔

سڑک کے اس پار، سرسبز شاخوں والے دروازے کی طرف اپنی کلارنٹ کا رخ کر کے ماسٹر ہالی نے اپنی خوبصورتی کالی گرگابی اتاری اور اپنے دھلے دھلائے سبک سے پاؤں زمین پر رکھ کر عید میلاد النبی کی شان میں بسنت بہار بجانی شروع کر دی اور تھوڑی دیر کے بعد بیخود

WWW.PAKS

سے ہو کر دائیں بائیں بھٹکنے سے لگے۔ میں نے ان کو مشکل مشکل راگ اور پیچیدہ راگنیاں بجاتے سنا تھا لیکن ان کی ناک کا بانسہ جہاں ستواں ہو جاتا تھا وہیں رہتا تھا' نہ سر کو جنبش ہوتی نہ کندھوں کو' نہ کہنیوں کے زاویے میں فرق آتا نہ چہرے پر کوئی اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا۔ نہ آنکھیں بند ہوتیں نہ ان کے ڈورے سفید ہوتے۔ سارا بت جامد رہتا بس ایک انگلیوں میں حرکت ہوتی اور وہی سارے وجود کو زندگی اور حرارت عطا کیے جاتی۔ لیکن اب سارا ٹریفک رک گیا تھا۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے تھے۔ ایک نہنگ جو بھنگ پی کر اور تلوار نکال کر اٹھکیلیاں کر رہا تھا پتھر کے بت کی طرح ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑا ہو گیا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد "ست نام سری واہگورو۔ ست نام سری واہگورو" کی آواز نکالتا تھا اور پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک ایک چیز رک گئی تھی۔ لوگ' ٹریفک' زمین' ہوا' وقت ہر شے ساکت ہو گئی تھی صرف ماسٹر بالی دائیں بائیں جھوم رہے تھے اور ہر لے' ہر قالی اور ہر تان کے ساتھ لہک رہے تھے۔ اصل میں وہ قربان ہو جانا چاہتے تھے اور ہو نہیں پاتے تھے۔ نثار ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور ان سے جگہ نہیں بن رہی تھی۔ وہ اس کھیل میں مر جانا چاہتے تھے لیکن زندہ کھڑے تھے اور تماشا بنے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا رجنی اپنے گھر سے ننگے پاؤں بھاگی آ رہی ہے۔ اس کے سر پر ایک موٹی سی پھلکاری تھی جس میں اس کا چہرہ تانبے کی طرح تمتمایا ہوا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی' حالانکہ اس کا گھر مسجد سے کچھ ایسا دور نہیں تھا۔ وہ آئی اور آ کر ماسٹر صاحب کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اتنی نزدیک جیسے ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہوں یا جیسے میاں بیوی ہوں' بھائی بہن ہوں' قریبی رشتہ دار ہوں' گورو اور چیلی ہوں!

مغرب کی اذان سے ٹھیک ایک منٹ پہلے ماسٹر صاحب نے ترانہ ختم کیا۔ گرگابی پہنی' بھیگے ہوئے کلارنٹ کو سر سے بندھا گیروا رومال اتار کر صاف کیا اور جدھر سے آئے تھے ادھر کو چلے گئے۔

اگلے دن صبح سویرے ہمارے علاقے کی دو جمعدارنیاں سروں پر اپنے اپنے ٹوکرے اٹھائے کہتی جا رہی تھیں: "باھمنوں کی بیٹی ہو کر مسجد کے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے مسلمانی ہوئے۔"

OCIETY.COM

۴

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور میں واپس اپنے کالج جا رہا تھا۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر جب میں سٹیشن پہنچا تو ماسٹر صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ گو میں نے اپنی روانگی سے متعلق انہیں دن اور وقت سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن وہ ٹاہلی کی چھدری چھاؤں میں کھڑے اپنے چہرے کو بار بار رومال سے پونچھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور مسکرا کر بولے "آخر میں نے پتہ لگا ہی لیا کہ تم کس وقت جا رہے ہو۔" میں کھسیانا سا ہو گیا تو میری شرمندگی ٹالنے کیلئے کہنے لگے "وہاں صدر میں کباڑی بازار سے رکن الدین کباڑیئے سے ایک پرانا کلارنٹ لے لینا۔ میرا نام لینا اور قیمت کے بارے میں اس سے جھگڑنا نہ کرنا۔" پھر انہوں نے اپنی جیب سے ایک پڑیا نکال کر کہا "اس میں دو پتیاں ہیں۔ لگا کر پریکٹس کرتے رہنا اور جب کوئی پتی سوکھ جائے یا ٹوٹ جائے تو مجھے خط لکھ کر ایک پتی اور منگوا لینا میں لفافے میں ڈال کر بھیج دوں گا۔ لیکن ریاض جاری رکھنا۔" میں نے ان کے ہاتھ سے پتیوں کی پڑیا لے لی اور "اچھا جی" کہہ کر گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔

وہ اسی طرح ٹاہلی کی چھدری چھاؤں میں کھڑے تھے اور رومال سے اپنا چہرہ پونچھ رہے تھے۔

کالج ہمارے ضلع کے صدر مقام میں واقع تھا اور ضلع میرے شہر سے پورے پچاس میل کی دوری پر تھا۔ پچیس میل کے فاصلے پر چھوٹی گاڑی چھوڑ کر براڈ گیج کی لائن اختیار کرنا پڑتی تھی اور دو گھنٹے کی مسافت کے بعد آدمی ضلع پہنچ جاتا تھا۔ ضلع اور چھاؤنی کے درمیان تین میل کا فاصلہ تھا جو بڑے بزرگ اور عورتیں تانگے میں طے کرتے تھے اور نوجوان سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ گورا پلٹن کے باہر یونین جیک لہرایا کرتا تھا جہاں دو نامی پہرے پر مامور تھے۔ اس جھنڈے کے سامنے سائیکل سے اتر کر چند قدم پیدل چلنا پڑتا تھا پھر

سائیکل پر سوار ہونے کی اجازت تھی۔

کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو بنانے' سنوارنے اور ابھارنے کیلئے میرے سامنے تین راستے تھے۔ کلارنٹ نوازی میں مہارت پیدا کروں۔ علامہ عیش کی شاگردی اختیار کر کے شاعری میں نام پیدا کروں یا باطن کا سفر اختیار کر کے ایک صوفی اور یوگی کی دھارنا دھاروں۔ مہینہ بھر کی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے شاعر بننا چاہیے اور اختر شیرانی کو پیچھے دھکیل کر اس کے مقام سے آگے نکل جانا چاہیے۔ میں نے اپنی سائیکل نکالی ایک نئی کاپی اور نئی پنسل خریدی اور شاعر بننے کیلئے علامہ عیش کے نال کی طرف چل دیا۔ صدر بازار کے دہانے پر ساعتی کا کتب خانہ تھا جو ادبی کتابیں بیچنے کے ساتھ ساتھ ٹائٹل اتار کر ایسی کتابیں کرائے پر بھی دیا کرتا تھا۔ میں نے اپنی سائیکل ساعتی کی دکان کے باہر کھڑی کی اور ساتھ والی گلی میں پوجیہ پنڈت رگھونندن جی کے آشرم میں چلا گیا۔

بوسیدہ دیواروں والے ٹھنڈے فرش پر ایک پرانی سی دری بچھی تھی۔ دس پندرہ آدمی چوکڑی مارے گیتا کا پاٹھ سن رہے تھے اور رگھونندن جی تین بڑے گاؤ تکیوں کے چولہے میں کنول آسن جمائے گیتا بودھ پر بھاشن دے رہے تھے۔ پانچواں ادھیائے تھا اور پنڈت جی کہہ رہے تھے:

ہے ارجن! کرم سنیاس یعنی کرموں کا تیاگ اور کرم یوگ یعنی کرموں کا کرنا دونوں ہی خوب ہیں مگر دونوں میں سے کرم تیاگ افضل ہے۔

میں نے کچھ سمجھے بغیر جلدی جلدی یہ بھاشن اپنی کاپی پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی کاپی تھی جو میں نے مشق سخن کیلئے خریدی تھی اور جسے لے کر میں علامہ عیش کی درسگاہ میں جا رہا تھا۔

پوجیہ پنڈت جی اپنی رانوں پر رکھے ہوئے دونوں پاؤں کے تلوؤں پر ہولے ہولے ہاتھ مار کر کہہ رہے تھے ہے ارجن! کسی سے کینہ نہ رکھنے والا اور کسی سے کسی چیز کی خواہش اور اچھا نہ رکھنے والا مکت ہو جاتا ہے۔ اسے سنیاسی کہنا چاہیے' لیکن کرم یوگ کے بغیر سنیاس میں کامیابی محال ہے مگر کرم کرنے والا یوگی اپنے من کی شدھی ہی سے بہت جلد پار برھم کو پالیتا ہے۔

ہے ارجن! اندریوں کی لذت کو اپنانا اور ان کی تکمیل کے بعد آنند حاصل کرنا دکھ کا باعث ہیں۔ ایسی لذتیں عارضی ہوتی ہیں اس لئے گیانی ان میں محو نہیں ہوتے۔

OCIETY.COM

پنڈت جی جو کچھ کہتے تھے میں لکھتا جا رہا تھا لیکن میری سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ البتہ جب وہ اشوک کی تشریح کرتے تھے اور ساتھ مثالیں دیتے تھے تو بات آپ سے آپ کھلنے لگتی تھی۔ ان کا بیان اس قدر سحر انگیز تھا اور اردو ہندی الفاظ کی آمیزش ایسی دلکش تھی کہ میں نے شاعر بننے کا اور اختر شیرانی کو شکست دینے کا ارادہ ان کے آسن پر ہی ترک کر دیا اور یوگ ابھیاس کی سکھشا کا پالن کر لیا۔ میں اپنی کاپی پر صرف اشلوک لکھتا تھا اور تشریح کیلئے ہمہ تن گوش ہو کر ان کی بات سنتا تھا۔ جب وہ اس اشلوک پر پہنچے کہ اندریوں کی کامناؤں کی تکمیل کے خیال کو ترک کر کے جو شخص اپنے ابروؤں کے درمیان دونوں آنکھوں کو جما کر پران اور اپان دایو کو برابر رکھ کر پرانایام کرے اس کو نہ تو نیند کا ڈر رہتا ہے اور نہ ہی اس کا دل خواہشات کی طرف دوڑتا ہے اور پرانایام کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

پھر انہوں نے "اوم" کی گونج میں اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے "پرانایام" کا مظاہرہ کیا اور بڑی دیر تک چپ سادھ کر پرانایام کی مشق بتائی۔ پہلے ان کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک رگ پھڑ پھڑائی اور پھر وہاں ایک گومڑا سا نمودار ہوا۔ اس گومڑے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ دل کی طرح دھڑکنے لگا۔ پھر اس میں تیزی کے آثار پیدا ہوئے اور جب یہ تیزی اپنے عروج کو پہنچی تو اس چڑھاؤ میں اتار آنے لگا اور دیکھتے دیکھتے یہ گومڑا بالکل زائل ہو کر ماتھے کی جلد کے ساتھ ہموار ہو گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرا کر لوگوں کو دیکھا اور نمسکار کر کے بولے: "پانچواں ادھیائے ختم ہوا کل اسی وقت چھٹے ادھیائے کا پاٹھ ہو گا۔ میری اور سے آپ لوگوں کو جانے کی آگیا ہے۔"

جب لوگ چلے گئے تو میں کھسکتا کھسکتا پنڈت جی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا "مہاراج میں مسلمان ہوں اور پرانایام کی مشق کرنی چاہتا ہوں کیا مجھ کو اس کی اجازت مل سکتی ہے؟" انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنی شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کہا "اس میں دین دھرم کی کوئی قید نہیں بابا۔ یہ تو من کو شانت کرنے کا اور بھگوان سے ملنے کا ایک مارگ ہے۔ پر ہے بڑا کٹھن اور اس کیلئے ابھیاس کی ضرورت ہے' پر نتو یہ ابھیاس دوسری قسم کا ہے۔ تم سے ہو گا نہیں۔

میں نے کہا "مہاراج میں بڑا ضدی اور ہٹیلا انسان ہوں جس کام پر اڑ جاتا ہوں اس کو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔ آپ مجھے اس کا بھید بھاؤ بتلائیں میں پورا کر لوں گا۔"

WWW.PAKS

انہوں نے مسکرا کر کہا "یہاں ضد اور ہٹ کا کام نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کوشش کے کارن کچھ بنتا ہے۔ اس میں تو بس ایک نیم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مشکل ہے۔"

میں نے کہا "میں ارادے کا بھی بہت پکا ہوں اور جو نیم ایک مرتبہ کر لیتا ہوں اس کو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔" کہنے لگے "پھر اس کے لئے تمہیں مرنے کا نیم کرنا ہوگا۔ جب تک مرو گے نہیں اس ساگر میں تیر نہیں سکو گے۔ لوتھ تیرے گی زندہ آدمی ڈوب جائے گا' یہی اس کا بھید بھاؤ ہے۔"

مرنے کا حکم سن کر میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا اور ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

کہنے لگے "تم ایک ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے منش ہو اور ہر ڈر اور ہر بھئے کی بنیاد ایک ہی ہے۔ موت! اگر تم اپنے ڈر کے اندر گہرا غوطہ لگا کر پاتال تک جاؤ گے تو وہاں اپنے ڈر کا ایک ہی کارن پاؤ گے۔ موت! اور جب تم موت کو سچ اور ست مان لو گے تو ہر طرح کا خوف دور ہو جائے گا۔ جب تم یہ بھید سمجھ جاؤ گے کہ موت ہی جیون کا راستہ ہے اور موت ہی جیون کا انتر بھید ہے اور تم جیتے ہی موت میں پراپت ہو چکے ہو۔ پھر تم میرے پاس آنا۔" میں ان کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا اور اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر وہ اپنے آسن سے اٹھتے ہوئے بولے "اس سنسار میں ایک ہی سچ ہے اور وہ ہے موت! باقی ساری چیزیں بے وشواش ہیں۔ ہو سکتا ہے ہوں ہو سکتا ہے نہ ہوں۔ پر موت کے بارے میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جب یہ ہے اور اوش ہے تو پھر ہر طرح کا خوف اور بھئے دور ہو جائے گا..... سوچ لو اور فیصلہ کر لو اور موت کو اچھی طرح سے جان کر اس سے یاری دوستی کر لو۔ اس سے پریچے کر لو۔ اس کے دھیان میں گہرے اتر کر اس سے میل ملاپ کر لو۔ پھر تم کو اپنے اصل کا حال معلوم ہو جائے گا اور تمہارا اصل روپ تمہارے سامنے آجائے گا۔ صوفی لوگ اسی کو مراقبۂ موت کہتے ہیں۔"

پنڈت جی کے منہ سے مراقبہ موت کی ترکیب سن کر میں حیران بھی ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ میری پریشانی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ موت سے شاعری بہتر ہے۔ سر جھکا کر انہیں پرنام کیا اور علامہ عیش کے ٹال پر چلا گیا۔

جب میں نے ضلعی مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے اپنی پہلی غزل علامہ عیش کی خدمت پیش کی تو انہوں نے اسے بغور دیکھ کر اپنے میلے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور فرمایا "کل اسی وقت آکر لے جانا اصلاح کر دوں گا۔" لیکن اگلے روز جب میں وقت مقررہ پر ان کی خدمت میں

حاضر ہوا تو انہوں نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر کاغذ نکالا اور غزل میرے حوالے کر دی' لیکن یہ میری غزل نہیں تھی۔ علامہ صاحب نے میری حوصلہ افزائی کے لئے اپنی طرف سے ایک غزل لکھ دی تھی جس میں صرف میرا تخلص موجود تھا۔ جب میں نے معذرت بھرے انداز میں کسی اور کی غزل مشاعرے میں پڑھنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے غصے میں آ کر کہا "شاعری کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اگر تم سو سال تک بھی اس میدان میں جھک مارو گے تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ تمہاری طبیعت موزوں نہیں ہے اور تمہارا ذہن وزن کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ تم کوئی اور کام کرو۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ شاعری سے راگداری بہتر ہے۔ علامہ عیش کو سلام کیا اور رکنے کباڑیئے کے یہاں بوزی کا ایک سیکنڈ ہینڈ کلارنٹ خریدنے چلا گیا۔

یونیورسٹی کے امتحانات کے قریب جب ہماری سینئر کلاسوں کی الوداعی پارٹی ہوئی تو لڑکیوں کے کورس کے بعد سٹیج سیکرٹری نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں اپنا کالا سیاہ' تیل سے چمکایا ہوا کلارنٹ لے کر سٹیج پر چڑھا اور سارے مجمعے کو ایک فاتح کی طرح سر گھما کر دیکھا۔ ماؤتھ پیس کو منہ میں ڈالنے سے پہلے میں نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا "میں آپ کی خدمت میں اپنے استاد ماسٹر بالی کی ایک بندش پیش کروں گا جو انہوں نے میاں کی ٹوڈی کے مدھم روپ میں تیار کی ہے اور جس کے سارے سر کومل باندھے ہیں۔"

جب میں نے ماؤتھ پیس میں پھونک لگائی تو پتی باڈی کے ساتھ چمٹی رہ گئی اور ہوا نلکی میں سے سیدھی ستیر گزر گئی۔ دوسری اور تیسری پھونک کے بعد میں نے پتی کو لعاب دہن سے لتھیڑا تو ہوا کا گزر بالکل ہی رک گیا۔ سامعین اوئے اوئے کر کے ہوٹ کرنے لگے اور چند ایک نے منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹیاں بھی بجائیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو منع کیا۔ پتی باہر نکال کر اسے لب لگا کر تر کیا اور پھر ایک بھرپور کوشش کی لیکن کلارنٹ کو نہ بجنا تھا نہ بجا۔ سارے ہال میں تالیوں' سیٹیوں اور بہہ جا بہہ جا کا شور اٹھا اور میں شرمندہ ہو کر سٹیج سے اتر آیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ راگداری سے پڑھائی بہتر ہے اور مجھے ایف اے کرنے پر پوری توجہ دینی چاہیے۔

ٹھیک ڈیڑھ دو مہینے بعد ہمارے کالج میں پرچہ لگا کہ ماسٹر بالی شہر میں آئے ہوئے ہیں اور آج شام سیشن جج اشرف چشتی کی کوٹھی پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چشتی صاحب کی بیٹی کی شادی پر وہ صرف اپنے کلارنٹ سے برات کا سواگت کریں گے اور شہر

WWW.PAKS

کے معززین اور انگریز افسران کے فن سے لطف اندوز ہوں گے۔ میں اس محفل میں جانے کے لئے بیقرار تھا لیکن میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نہ میں معزز شہری تھا اور نہ انگریز افسر۔ نہ ہی میری سیشن جج کے عملے سے کوئی واقفیت تھی کہ کسی کلرک کے ساتھ مل کر برات کے خادموں میں اپنا نام درج کروالیتا اور لوٹا جگ لے کر ادھر ادھر گھومنے والوں میں شامل ہو کر اس محفل میں شرکت کر سکتا۔ اسی مایوسی کے عالم میں ہوسٹل جا کر اپنا کمرہ بند کیا اور گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کے وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی بچتر سنگھ کی کرخت آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے بچتر سنگھ اپنے کیسوں پر دہی لگائے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں موٹا سا ایک ڈنڈا تھا۔ اس کے پیچھے ماسٹر پالی کھڑے تھے جن کے بائیں ہاتھ پر سبز رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا تھا۔ بچتر نے کہا "لے بھئی سنبھال اپنا پردھنا' میں ہوسٹل سے کتے بھگانے جا رہا ہوں۔ سالوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔"

ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں نے جلدی جلدی کتابیں اٹھا کر ان کے لئے کرسی خالی کی اور خود ان کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولے "تمہیں بے وقت جگا دیا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یہ وقت تمہارے سونے کا ہے تو میں کسی اور ٹائم آ جاتا۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں سرکار آپ کے آنے سے تو جاگرتی ہو گئی ہے سونا کیسا۔"

میرے منہ سے سرکار کا لفظ سن کر ان کو تھوڑی سی حیرت ہوئی اور انہوں نے پلٹ کر میز سے کلارنٹ اٹھا لیا۔ کہنے لگے "اچھا دانہ ہے' مشق کرتے ہو؟"

میں نے کہا "دو تین دفعہ کوشش کی تھی لیکن مجھ سے تو یہ بجا ہی نہیں۔ ماؤتھ پیس کھوچلا ہے ہوا دے جاتا ہے۔" انہوں نے کلارنٹ کو الگ الگ کیا۔ چابیوں کی ترد یکھی۔ پتی کو اتار کر پھر اپنی جگہ پر لگایا اور کلارنٹ جوڑ کر منہ سے لگا لیا۔

اسے اتفاق کہیے یا کشف۔ انہوں نے میاں کو ٹوڈی کی وہی بندش بجانی شروع کر دی اور اس میں ایسی ایسی مینڈھیں بھریں کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ کوئی پانچ منٹ تک یہ بندش بجانے کے بعد انہوں نے کہا "بڑا سریلا دانہ ہے کتنے میں ملا؟"

میں نے قیمت بتائی تو وہ اور بھی حیران ہوئے اور پوچھنے لگے "اس کا کیس بھی ہے؟"

میں نے کہا "جی ہے۔"

کہنے لگے "اس کو میز پر نہیں رکھا کرتے۔ کھول کر' کیس میں بند کر کے' الماری کے

اندر رکھا کرتے ہیں۔ گرمی سے اس کے جوڑ ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔" پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کیس طلب کیا۔ کلارنٹ کھول کر اس کے اندر رکھا اور میرے حوالے کر دیا۔

میری پڑھائی کے بارے میں رسمی سی گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور گلوگیر لہجے میں بولے "تم نے میری ذات پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ میں عمر بھر نہیں دے سکتا۔"

میں اپنے کرتوت پر دل ہی دل میں پہلے ہی شرمندہ تھا ان کی یہ بات سن کر زمین میں گڑ گیا۔ نہ کچھ کہہ سکتا تھا نہ بول سکتا تھا اور نہ ہی معافی مانگنے کا یارا تھا۔ اسی طرح پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔

کہنے لگے "رجنی کی شادی ہو گئی اور خدا کے فضل سے ایک ہفتے کے اندر اندر ہو گئی۔"

"کہاں؟" میں نے چیخ کر کہا۔

فرمایا "یہ پتہ نہیں کہاں ہوئی ہے البتہ اس کی بارات بھاگسر سے آئی تھی اور ادھر ہی کو اسے بیاہ کر لے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "ماسٹر صاحب وہ آپ سے دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اور ہر گھڑی آپ ہی کے خیال میں رہتی تھی۔" "اسی لئے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے عین وقت پر میری جان بچا دی۔ میرے دل میں بھی کچھ ویسی ہی محبت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔"

میں نے کہا "آپ کو پتہ ہے کہ میں اس کی ماں سے ملا تھا۔"

"اس نے خود مجھے بتایا تھا۔" ماسٹر صاحب بولے۔

"اس کی ماں نے؟"

"نہیں خود رجنی نے، وہ تم سے ناراض تھی لیکن کچھ اتنی بھی نہیں جس قدر اسے ہونا چاہیے تھا۔ بس خفا خفا سی تھی۔"

"آپ سے پھر بھی ملتی رہی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے بعد صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن بڑی بھرپور۔ شادی سے پہلے اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اگر مجھے برات کے ساتھ بھیجنے کی خواہش ہے تو مجھے ماسٹر باقی سے آخری ملاقات کرنے دے ورنہ بھول جا کہ میں بھاگسر کے چنڈتوں کے گھر جاؤں گی۔"

"پھر وہ مانی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

WWW.PAKS

"اس کی ماں خود اسے میرے چوبارے پر چھوڑنے آئی اور صبح پانچ بجے واپس اپنے ساتھ لے گئی۔"

"ساری رات!" میں نے چیخ کر کہا۔

"ساری رات۔"

"لیکن ماسٹر صاحب وہ ویسی تو نہیں تھی۔"

"وہ ایسی بھی نہیں تھی جیسی تم سمجھ رہے ہو اور وہ اس طرح کی بھی نہیں تھی جیسے میں سمجھتا رہا تھا۔ وہ بس کچھ اور ہی چیز تھی اگر کچھ دیر اور تخت پور میں رہتی تو میں زندہ نہ رہتا۔"

"لیکن وہ اپنے سسرال سے آتی بھی تو رہے گی۔"

"بھلے آتی رہے اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اب وہ مجھ پر حملہ آور نہیں ہو گی۔"

"حملہ آور!" میں نے گھبرا کر پوچھا تو وہ سر جھکا کر کہنے لگے "وہ شکتی کا روپ تھی جو لاکھ برس کا یگ بتانے کے بعد کسی روپ متی کے پردے میں اترتا ہے۔ پھر کسی طے شدہ رات کے اندر ایک مرگ کا خون پی کر واپس اداشی میں چلا جاتا ہے۔"

"تو اب وہ واپس چلا گیا" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"چلا گیا۔"

"اور خون پی گیا؟"

"ڈٹ کے پی گیا' سیر ہو کے پی گیا' کئی جھلیاں لگا گیا۔"

"آپ نے خود اسے خون پیتے ہوئے دیکھا؟ شکتی کے روپ کو؟"

"دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا لیکن اسے کوئی کوئی سہار سکتا ہے۔ ایسا کوئی جس کے ساتھ کسی کی دعا ہو' کسی کی پرارتھنا ہو' اشیر واد ہو۔"

"آپ کے ساتھ کس کی دعا تھی ماسٹر صاحب؟"

"میرے ساتھ رجنی کی اشیر واد تھی اور اسی کی پرارتھنا تھی۔"

"اور وہی شکتی کا روپ تھی!"

"وہی شکتی کا روپ تھی بلکہ وہی شکتی تھی۔" انہوں نے خوف سے نکلتے ہوئے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ پکڑ کر بولے "تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے جو اس کی ماں سے مل کر ساری صورتحال واضح کر دی۔ ایسا نہ کرتے تو مجھے روز جینا پڑتا اور روز مرنا اور صرف مرنے کے لئے ہر روز جینا بڑا ہی کٹھن کام ہے۔"

OCIETY.COM

تھوڑی دیر بعد انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور چہک کر بولے "آج شام فنکشن پر آرہے ہو ناں" میں نے کہا "حضور میں کس طرح آسکتا ہوں میرے پاس تو کوئی دعوت نامہ ہی نہیں۔"

"دعوت نامہ!" انہوں نے حیرانی سے کہا "دعوت نامہ!! تمہیں تو سیشن جج کی بگھی ہوسٹل سے لینے آئے گی تم وقت مقررہ سے پہلے تیار رہنا۔"

میں نے کہا "آپ نے تو کبھی کسی بیاہ شادی پر پرفارمنس نہیں دی یہاں کیسے مان گئے۔"

رازدارانہ لہجے میں بولے "اپنے یاردان سنگھ کا کیس اسی سیشن جج کے پاس ہے اور جج نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اسے اگلی پیشی پر رہا کر دوں گا بشرطیکہ میں اس کی رہائی سے پہلے ہی جج کی کوٹھی پر شادیانے بجادوں۔" میں بھونچکا سا بیٹھا رہا تو میرا کندھا ہلا کر بولے "کوئی مہنگا سودا ہے شفائی؟"

۵

مستری دان سنگھ رہا ہو کر واپس تخت پور پہنچ گیا۔ رجنی تخت پور سے بھاگسر چلی گئی۔ چوک کے فوارے کو پانی کا کنکشن مل گیا۔ شہر میں بجلی آ گئی۔ بجلی کے ساتھ چھ گھروں میں ریڈیو سیٹ آ گئے۔ ریڈیو پر شام کے وقت برلن سے خبریں سنی جانے لگیں۔ انگریز سے نفرت بڑھ گئی۔ لوگ فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ معززین شہر نے بیکار جوانوں کو دس دس روپے دے کر ان کی بھرتی دینا شروع کر دی اور ہر رنگروٹ کے بدلے انگریز سرکار سے سرٹیفکیٹ لے کر فائل میں لگانے لگے۔ ڈپٹی کمشنر کے دربار میں پروٹوکول تبدیل ہو گیا۔ جس کے پاس بھرتی کرانے کے زیادہ سرٹیفکیٹ ہوتے ان کو اگلی قطاروں میں جگہ ملتی اور جنہوں نے پچاس سے اوپر جوان فوج میں بھرتی کرائے ہوتے انہیں دہلی دربار میں وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا موقع بھی عطا کیا جاتا۔

روميل عرب دنیا کے ریگستانوں میں لڑ رہا تھا۔ جاپانی برما پر کئی حملے کر چکے تھے۔ امریکہ جنگ میں داخل ہو چکا تھا اور سبھاش چندر بوس غائب ہو چکے تھے۔ جاپان کی طرف سے ایسی خبریں آ رہی تھیں کہ نیتاجی نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھ دی ہے اور وہ چند ہی روز میں ہندوستان فتح کر کے اسے آزاد کروا رہے ہیں۔

مستری دان سنگھ کی رہائی کی خوشی میں ماسٹر صاحب نے اپنے چوبارے پر چار چراغ چوکھیا جلائے تھے اور نوچندی جمعرات سے لے کر اگلی نوچندی تک مہینہ بھر تک اس کا التزام کیا تھا۔ دوسری جمعرات انہوں نے دربار صاحب میں اکھنڈ پاٹھ بھی کرایا تھا اور اس کے سارے اخراجات خود برداشت کئے تھے۔ نہر کے بنگلے سے میرے کالج ٹیلی فون کر کے دو دن کے لئے مجھے بھی بلا لیا اور جب ہم سروں پر رومال باندھ کر دان سنگھ کے ساتھ

OCIETY.COM

گورو گرنتھ صاحب کو سلام کرنے اندر داخل ہوئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماسٹر صاحب نے دو گھٹنے زمین پر ٹیک کر اور دونوں ہتھیلیاں فرش پر لگا کر اپنا سر گورو گرنتھ صاحب کے آگے بہت ہی نیچا کر کے جھکا دیا۔ وہ پورا ماتھا ٹیکنا تو نہیں تھا البتہ ایک طرح کا سجدہ ہی تھا۔ میرے دل میں ذرا سی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا جہاں دان سنگھ سنگ مرمر کے فرش پر ماتھا ٹیکے رو رہا تھا اور اس کا بدن مسلسل ہچکیوں کی وجہ سے پرانی لاری کی طرح سٹارٹ ہو کر کانپ رہا تھا۔

جب تک ماسٹر صاحب اپنے سجدہ رکوع سے برآمد نہ ہوئے میں اور دان سنگھ ہاتھ باندھ کر گورو گرنتھ صاحب کے سامنے کھڑے رہے۔

اکھنڈ پاٹھ کے بعد ماسٹر صاحب میرے ساتھ ضلع آ گئے اور ایک دن مہادیالہ کے نگران شنکر داس کے یہاں گزار کر اگلے دن مجھے ہربلبھ کے میلے پر جالندھر لے گئے۔ اس میلے نے مجھے اپنی زندگی سے اکھیڑ کر ایک اور ہی دنیا سے وابستہ کر دیا اور میں ان خیالوں میں رہنے لگا کہ خواب کی دنیا خاص طور پر رات ڈھائی بجے سے صبح پانچ کی دنیا ہی اصل دنیا ہوتی ہے باقی سب دھوکا اور سراب ہے۔

ہم عملی طبلہ نواز کے ڈیرے پر ٹھہرے تھے جس کی کل کائنات طبلوں کی ایک جوڑی، گلے کا ایک میلا چیکٹ تعویذ اور پیتل کا ایک تاملوٹ تھا۔ وہ تاملوٹ میں ڈوڈے ڈال کر سارا دن انہیں ملتا رہتا اور شام کے وقت اپنا عمل کر کے پینک میں جب طبلہ بجاتا تو میرے سرکار زمین پر بیٹھ کر اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیتے اور جب تک وہ طبلہ بجاتا اسی طرح بیٹھے رہتے۔ بہت سے زائرین اس کے ڈیرے پر جمع ہو جاتے اور پھر اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ لوگوں کے ہجوم میں دم گھٹنے لگتا۔

ایک دوپہر عملی نے ڈوڈے مسلتے ہوئے مجھے بتایا کہ میرے استاد ماسٹر بالی کا باپ طفیل خان اور عملی دونوں شام چوراسی کے رہنے والے تھے اور گہرے دوست تھے۔ دونوں جوڑی بجاتے تھے اور استادوں کے ساتھ سنگت کرتے تھے۔ میرے استاد ماسٹر بالی کی ماں بغدادی بی بی اپنے اکلوتے بیٹے اقبال خاں کو چھوڑ کر ہیرے نانبائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور طفیل خاں اپنے بیٹے کی انگلی پکڑ کر شام چوراسی سے مدراس چلا گیا تھا۔ آخری عمر میں وہ پھرتا پھراتا اور دھکے کھاتا تخت پور پہنچ گیا اور ڈھول گلے میں ڈال کر بھرائیوں کا کام کرنے لگا۔ عملی نے ڈوڈے مسلتے ہوئے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا "طفیل خان بڑا گنی آدمی تھا پر قسمت

نے اسے ٹلیلی سے بھرائی بنادیا۔ مرنے سے چند مہینے پہلے اس نے چٹھی لکھ کر مجھے شام چوراسی سے بلوایا اور بالی خاں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا "اب اس کا والی وارث تو ہے چاہے تو اپنے ساتھ شام چوراسی لے جا اور مناسب سمجھے تو اسے کسی دربار میں نوکر کرا دے۔ میرا کھیل تماشا ختم ہے اور میری بس ہے!"

عملی کہنے لگا میں تیرے استاد کے باپ کی موت کے بعد تین مہینے تک میں تخت پور میں رہا لیکن تیرا استاد میرے ساتھ شام چوراسی جانے پر رضامند نہ ہوا۔ پھر میں نے مہاراجہ فرید کوٹ کے دربار میں اس کی نوکری کا بندوبست بھی کیا لیکن یہ نہیں مانا اور ایک ہی ضد پر اڑا رہا کہ تخت پور میں میرے باپ کی قبر ہے اس کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا' سو نہیں گیا۔

میں نے کہا "اور ان کی والدہ 'بغداوی بی بی؟"

بولا "زندہ ہے مگر بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے اور آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔ لوگ بڑے استاد کی بیوی جان کر بڑا مان آدر کرتے ہیں پر بیٹے کو بہت یاد کرتی ہے۔"

"ان کو پتہ نہیں کہ ان کا بیٹا کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ناں" عملی نے ایک ڈوڈے کو تاملوٹ سے نکال کر دیکھتے ہوئے کہا "ناں اس کو پتہ ہے اور نہ ہی میں بتاتا ہوں۔"

"اور وہ تایا بائی؟"

"وہ بیچارا لدھیانے میں فوت ہو گیا۔ ریلوے لائن کراس کر رہا تھا اوپر سے گاڑی آ گئی' وہیں ختم ہو گیا۔"

جالندھر میں قیام کے دوران میرا کئی مرتبہ دل چاہا کہ ماسٹر صاحب سے ان کی والدہ کا اور ان کے شہر کا تذکرہ کروں لیکن مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ کچھ ایسے لگتا تھا کہ اگر میں ان سے اس بات کا تذکرہ کروں گا تو وہ مجھ سے قطع تعلق کر لیں گے اور دوبارہ ان سے ملنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس اندیشے نے ایسے اہم تاریخی واقعے کو میرے ذہن سے بالکل محو کر دیا اور میں جلد ہی اپنی نارمل حالت کی طرف لوٹ گیا۔

OCIETY.COM

۶

ہر بلھ سے واپسی پر میرا اندر باہر راگ رنگ سے بھیگ گیا تھا اور ہر دے میں ہر وقت جلترنگ سا بجتا رہتا تھا۔ ہوسٹل پہنچ کر میں نے اپنا کلارنٹ نکالا' جوڑوں پر دھاگا لپیٹا۔ چابیوں کو صاف کر کے سپرنگوں کو سنگر کا تیل دیا۔ ڈھکنیوں کو ولایتی صابن کے سلوشن سے صاف کیا اور باڈی پر کھوپرے کا تیل مل کر اسے لٹکایا۔ ماؤتھ پیس کو پانی میں ڈبو دے کر تر کیا اور سیلی پتی کو لب لگا کر جب میں نے سرگم بجایا تو یوں لگا جیسے یہ آواز کہیں اور سے آئی ہو۔ کسی گپھا کے اندر سے یا نرسلوں کے جنگل سے۔ میں نے ایک پاؤں کرسی پر رکھ کر اور دوسرے پر پورا بوجھ دے کر اپنے استاد کے انگ میں تلک کاموود کی نقل شروع کر دی۔ مجھے اس کی تین تال کی سرگم تو یاد تھی پر اس کی خاص تان: پانی سارے گا سا۔ سارے گا ما پا سارے گا سا بیچ میں پلٹا کھا جاتی تھی۔ بجاتے بجاتے کبھی اس کی شکل دیس کی بن جاتی تھی اور کبھی تلنگ کے آس پاس پہنچ جاتی تھی۔ سمجھ کم تھی' صرف گھوٹا لگایا ہوا تھا۔ ادھر سے ادھر نکل جاتا۔ ادھر سے کچھ اور ہی شروع ہو جاتا لیکن کیفیت کمال کی تھی۔ غلط سلط بجاتا رہا اور بجاتا ہی گیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ کچھ بھی نہیں تھا' نہ کوئی راگ تھا' نہ سرگم درست تھا۔ بس اک شیخی سی تھی اور چند راگوں کے نام یاد تھے۔ لیکن اس شیخی کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے باقاعدگی سے ریاض شروع کر دیا اور اپنے بھانویں خود کو اگلے ہر بلھ کے لئے تیار کرنے کا پروگرام بنا لیا۔

بین' پونگی' بانسری کلارنٹ جہاں بھی بجتی ہے وہاں کچھ نمودار ضرور ہوتا ہے اردگرد کچھ بھی نہ ہو۔ بس خالی اور سپاٹ ہو۔ دور دور تک کوئی آثار نہ ہو۔ نہ ویرانہ ہو نہ سنسان' نہ زمان ہو نہ مکان' نہ ہوتا ہو اور نہ ہو سکتا تو اس کے درمیان ہویدا ہو جاتا ہے۔ اصل میں تو کوئی درمیان بھی نہیں ہوتا بس ہستی ہی بل کھا کر ہویدا بن جاتی ہے۔ لوگ ہر بل کھانے والی چیز کو سانپ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ سانپ نہیں ہوتا۔ بین کی آواز پر ہویدا ہوتا ہے' لوگ ہویدا

کو سانپ کہنے لگ جاتے ہیں!

ایک دوپہر میں اپنا کمرہ اچھی طرح سے بند کر کے کلارنٹ بجا رہا تھا اور کومل سروں پر رک رک کر زبردستی اپنا بدن لہرا رہا تھا ساتھ ساتھ کلارنٹ کو بین بجیا جوگیوں کی طرح گردش بھی دے رہا تھا کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے رک کر کان آہٹ پر لگائے تو پھر کسی نے دھپ دھپ میرا دروازہ بجایا۔ کلارنٹ چارپائی پر رکھ کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رجنی کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر گردن گھما کر اپنے ساتھی سے آؤ کہا..... اور اندر داخل ہو گئی۔ سر سے چادر اتار کر میری چارپائی پر پھینکتے ہوئے اس نے اپنے گریبان کو چٹکی سے پکڑ کر اس میں دو تین بار ہوا بھری اور پھر کہنے لگی "ہم فیروز پور آئے تھے سوچا تم سے بھی ملتے چلیں۔ یہ میرے پتی ہیں۔ ہائے آج کتنی گرمی ہے۔" میں نے اس کے پتی سے ہاتھ ملایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ سبز کائی والے جوہڑ کا مینڈک آ گیا ہو۔ وہ چھوٹے قد کا ایک کم رو اور بے یقینا سا شخص تھا جس نے سر پر پیلے رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی اور ماتھے پر سرخ رنگ کے قشقے میں چاول کا ایک دانہ چپکا ہوا تھا۔

میں نے اپنی کرسی اسے پیش کرتے ہوئے خندہ پیشانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ کچھ کہے سنے بغیر دھب سے اس میں بیٹھ گیا۔ رجنی کہنے لگی "ان کے فالسے کے اپنے باغ ہیں اور منڈی میں آڑھت کی دکان ہے۔ میرے سسر کے اکلوتے بیٹے ہیں اور سارا کام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔"

اسے دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ اپنے ظلم کا احساس ہوا کہ میں نے کیوں رجنی کی ماں سے بات کی اور کیوں اسے آڑھت کے کنوئیں میں دھکیلا۔

رجنی امید سے تھی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے بستر پر نیم دراز تھی۔ میں پائنتی کی طرف بیٹھا تھا اور اس نے میرا تکیہ اور کھیس ملا جلا کر ایک گاؤ تکیہ سا بنا لیا تھا جس سے ڈھوئگا کر وہ پہلو کے بل یوں لیٹی ہوئی تھی کہ اس کی ایک تہہ شدہ ٹانگ تو بستر پر تھی اور دوسری کا پاؤں ابھی تک زمین پر ٹکا ہوا تھا۔

میں نے اس کے خاوند کی طرف منہ کر کے کہا "آپ لسی پئیں گے کہ چائے؟"

رجنی نے اس کے جواب سے پہلے منہ پھاڑ کر کہا "یہ بھی کوئی موسم ہے چائے کا، لسی منگواؤ۔"

جب میں نک شاپ پر لسی کا آرڈر دینے کے لئے اٹھا تو اس کے پتی نے منمنی آواز میں

OCIETY.COM

پوچھا "رسویا کون ہے؟"

رجنی نے جھڑک کر کہا "یہاں سبھی ہندو کر بچاری ہیں پنڈت جی' آپ مریں ناں کچھ نہیں بھرشٹ ہوتا۔" اس نے ویسی مریل آواز میں کہا "میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔"

جب میں نک شاپ کے لڑکے سے سیخی اٹھوا کر دو گلاس جھاگ والی لسی بنوا کر لے آیا تو رجنی نے چھوٹتے ہی کہا "اور تمہارا گلاس؟"

میں نے کہا "میں نے ابھی چائے پی ہے اس لیے اوپر سے ٹھنڈی لسی نہیں پی سکتا۔"

پھر میں نے پنڈت جی کو سنانے کی غرض سے لڑکے کا نام اونچی آواز میں پکار کر کہا "شمبھو! گلاس ذرا ٹھہر کر لے جانا۔" اور جب وہ چلنے لگا تو میں نے کہا "شنکر سے کہنا دو گلاس ہی لکھے ایک اور نہ ڈال دے میرے نام۔"

شمبھو "اچھا جی" کہہ کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ رجنی دو ہی بڑے بڑے گھونٹوں میں آدھا گلاس ختم کر گئی تھی اور اس کا پتی برف کی ڈلیوں سے ڈر ڈر کر اپنا منہ بار بار گلاس سے اٹھا لیتا تھا۔

رجنی نے کہا "اس طرح سے جو تڑپ رہے ہو تو باہر جا کر ساری ڈلیاں ایک ایک کر کے انگلی سے نکال آؤ اور آ کر آرام سے پیو۔"

وہ چابی والے گڈے کی طرح اٹھا اور ڈلیاں گلاس سے نکالنے باہر چلا گیا۔ رجنی نے گلاس میری طرف بڑھا کر کہا "اوئے دفع ہونے تو بھی پی لے۔ بڑی مزیدار ہے۔"

میں نے گلاس لے کر ابھی دو گھونٹ ہی پیے تھے کہ اس نے جھپٹا مار کر گلاس پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر لسی پینے لگی۔

اس کے پتی نے باہر سے آ کر بتایا کہ انگلی ٹیڑھی کر کے بھی ڈلی بڑی مشکل سے پکڑی جاتی تھی۔ چار تو نکل گئیں ایک ابھی بھی اسی طرح سے تیر رہی ہے۔

"رجنی نے کہا "کوئی بات نہیں اب یہ تم کو تنگ نہیں کرے گی۔ اس کو سمجھا دیا ہے۔"

لسی پیتے ہوئے اور گریبان میں ہوا دیتے ہوئے رجنی نے مجھ سے میرے گھر والوں کی بابت پوچھا۔ میری پڑھائی اور امتحانوں کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کیا اور اپنے خاوند کو بتایا کہ میں مرلی بہت اچھی بجاتا ہوں۔ کلارنٹ کی جگہ مرلی کا نام سن کر مجھے اپنے آپ سے اور اپنے کلارنٹ سے ہینگ کی سی بو آنے لگی۔ میری اس بیزاری کو بھانپ کر وہ ہولے سے ہنسی اور کہنے لگی "ذرا دکھاؤ تو پنڈت جی کو اپنی مرلی۔"

WWW.PAKS

میں نے بادل ناخواستہ کلارنٹ اٹھایا اور اسے پنڈت جی کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے اسے ایک نظر لسی والے گلاس کے اندر سے دیکھا اور گلاس سمیت اثبات میں سر ہلا دیا۔

رجنی نے کہا "ریاض کرتے ہو؟"

میں نے کہا "پہلے تو میں نے چھوڑ دیا تھا پر اب پھر سے شروع کر دیا ہے۔"

"چھوڑ کیوں دیا تھا" اس نے ہیڈ مسٹریس کے لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا "بس ایسے ہی 'من نہیں لگتا تھا۔"

کہنے لگی "من لگانے والی کے آنے میں تو ابھی کافی دیر ہے جب تک اس سے اور پڑھائی سے دل لگانا پڑے گا۔" پنڈت جی نے لسی کا گلاس ختم کر کے میز پر رکھا تو رجنی بولی "اپنے استاد سے سبق لینے جاتے ہو؟"

میں نے کہا؟؟ برہ کے ماروں کا سبق لینا کیا۔ ادھر میرا استاد ادھر میں 'بیچ میں دکھ کا گہرا ساگر۔ لمبا فاصلہ لمبا راستہ..... بھولا کون جھلائے۔"

میری بات سنی ان سنی کر کے بولی "کوئی ایسا کلارنٹ بجا سکتا ہے جیسا مسجد کے باہر اس روز بجا تھا؟"

پھر خود ہی کہنے لگی "کوئی نہیں بجا سکتا۔ دیوتا بجا سکتا ہے' پر دیوتا بار بار پرتھمی پر تو نہیں آتے۔ آ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں آ سکتے" اس کے پتی نے مردانہ آواز میں کہا "وہ شکتی مان دیو ہوتے ہیں جب چاہیں آ جائیں پر منوان کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"پھر ایک بار تو وہ آ چکے ہیں" رجنی نے کہا "پر اب کوئی خاص امید نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیوں نہیں جی' ان کی موج ہے چاہیں تو پھر آ جائیں نہ چاہیں تو کبھی نہ آئیں....."

"اور کھیتیاں سوکھی رہ جائیں" رجنی نے بات کاٹ کر کہا۔

"سوکھی کیوں' کھیتیاں تو سرسبز ہیں" میں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ تو رجنی بولی "جھاڑ جھنکاڑ' جڑی بوٹی اور سرکنڈے کے بیڑ کھیتی نہیں ہوتے' ایسے ہی پھیلتے جاتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک ہم خاموش رہے۔ پھر میں نے چور آنکھوں سے رجنی کی طرف دیکھا۔ گربھ کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر خوبصورت ہو گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں وہ چمک اور بالوں میں وہ مہک نہیں تھی۔ اس کو شاید اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں اس کی ماں سے ملا

OCIETY.COM

تھا اور میں نے ہی اس کی زندگی میں نہ ختم ہونے والا کھنڈت ڈالی تھی۔ لیکن اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنے سر پر خاک اور خاکستر ڈالنے والے کو وہ دل سے معاف کر چکی ہے۔ تھی تو بابمنی پر اسنکبار کی اصل مسلمانی تھی۔

جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک روپیہ نکال کر رجنی کو دیتے ہوئے کہا "تو پہلی مرتبہ میرے گھر آئی ہے یہ تیری نذر ہے۔" اس نے روپیہ لے کر ماتھے سے لگایا اور اپنے گریبان کے اندر رکھ لیا۔ میرے پاس کوٹی کے ہیئر آئل کی ایک بند شیشی تھی جو میں نے جیجاجی کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے ڈھکنا کھول کر اسے سونگھا پھر خوش ہو کر بولے "بڑی سواد شٹ سنگدھ ہے۔"

میں انہیں تانگے میں بٹھا کر لاریوں کے اڈے تک چھوڑنے گیا۔ جیجاجی کے پیچھے لاری میں داخل ہوتے وقت رجنی نے میرے بازو میں اتنے زور کی چٹکی کاٹی کہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ جیجاجی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رجنی کہنے لگی "قمیص اتارو قمیص اتارو۔ اس میں ضرور کوئی بھڑ گھس گئی ہے اتارو گے نہیں تو پھر کاٹے گی۔"

میں نے قمیص کے بازوؤں کو اور اس کے دامن کو زور سے جھٹکا اور مسکرا کر کہا "نکل گئی ہے۔"

رجنی بولی "کالی تھی کہ پیلی دفع ہوئی!"

میں نے کہا "ملی جلی تھی' کالی اور پیلی۔"

جیجاجی بولے "پھر تو ڈیمو ہو گا کابلی بھونڈ۔"

میں نے کہا "ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔ ادھر کو اڑ گیا ہے۔"

رجنی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہنسنے لگی اور کھڑکی سے منہ نکال کر بولی "کالی بلاؤں اور کیڑے پتنگوں کا دھیان رکھا کرو۔ پردیس میں رہتے ہو اگر کچھ ہو گیا تو ہم اتنی دور سے آ بھی نہیں سکیں گے۔" پھر وہ شرارت سے ذرا اونچی آواز میں ہنسنے لگی اور ہنسی ہنسی میں لاری سٹارٹ ہو گئی۔

WWW.PAKS

۷

جب میں لاریوں کے اڈے سے آہستہ آہستہ چلتا واپس اپنے ہوسٹل آرہا تھا تو مجھے مستری دان سنگھ یاد آگیا۔ دراصل وہ یاد نہیں آیا اس کی کہانی یاد آگئی۔ وہ کہانی ہم نے اس سے اتنی مرتبہ سنی تھی کہ زبانی یاد ہو گئی تھی اور میں اور میرے استاد اسے پیرا بائی پیرا ایک دوسرے کے آگے پیچھے اسی تسلسل میں سنا لیتے تھے جس طرح دان سنگھ سنایا کرتا تھا۔

مستری دان سنگھ میں دو خوبیاں تھیں ایک تو وہ کاٹھ کے کام کا بہت ہی اونچا فنکار تھا اور اس تخلیقی صلاحیت نے اسے اعلیٰ درجے کا کبت جوڑ اور قافیہ داں شاعر بنا دیا تھا اور اس کے طنزیہ اور ہجویہ کبت کسی پر گراں نہیں گزرتے تھے' دوسرے وہ جب بھی اپنے اڈے پر پاؤں کے بل یا سرین کے بل بیٹھ کر کام کرتا تو آدھا ننگا ضرور ہوتا۔ کچھرے کی موہری میں سے کبھی سجے پاسے اور کبھی کھبے پاسے' اس کی برہنگی ضرور عیاں رہتی اور وہ اپنی لگن کے ساتھ کار کیے جاتا۔ اس کا ننگ ایک چھوٹے بچے کا ننگ تھا جو اس کی ذات کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس میں فحش اور عریاں انسانوں والا قصہ نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی نشست عمداً فحش ہوتی تھی۔

ماسٹر بالی جب بھی اس سے جل پری کی کہانی سننے کی فرمائش کرتے تو وہ گردن کے پیچھے کیسوں میں کھڑی انگلی پھیر کر کہتا "تو نہ بھی کہتا ناں ماسٹر تو میں نے یہی بات سنانی تھی۔ کیوں بھلا؟...... وہ اس واسطے کہ مجھے دوسری کوئی کہانی آتی ہی نہیں۔

"لو جناب آج سے دور' اگلے زمانے اور پرانے وقتوں میں بلکہ اگلے سے بھی اگلے زمانے میں' بہت ہی پہلے ایک سردار' جاگیردار' شاہ وریام اپنے رقبے پر بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ہنسی خوشی رہتا تھا اور اپنے کمی کمین' ہولے مزارعے' بردے کامے کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ان کے

OCIETY.COM